حکیم محمد یوسف حضروی اور اُن کا سفر نامہ سیرِ سوات

ارشد محمود ناشاد*

پنجاب کے شمال مغرب میں آباد ضلع اٹک کا ایک علاقہ ''چھچھ'' اپنی زرخیزی اور مردم خیزی کے اعتبار سے دُور ونزدیک میں مشہور ہے۔اس علاقے کو قدیم زمانے میں ''چھکشا'' یا ''شکشا'' (Chhuksha) کہا جاتا تھا اور یہ ٹیکسلا کی راج دھانی کا ایک صوبہ تھا[۱]۔معروف چینی سیّاح فاہیان نے اپنے سفر نامے میں جس علاقے کو سرشا ساہزرہ (Shirshasa Hasra) کہا ہے،اس میں سرشا سا،چھچھ اور ہزرہ ہزارہ کے لیے مستعمل ہے[۲]۔چھچھ اور ہزارہ کا نام جغرافیائی قُرب اور تہذیبی سانجھ کے باعث اکثر اکٹھا لیا جاتا رہا ہے۔ایک قدیم دوہا جو مغل شہنشاہ نورالدین جہاں گیر سے منسوب ہے،اس میں گندم کی بہترین پیداوار کے لیے چھچھ ہزارہ کا نام اکٹھا لیا گیا ہے،دوہا یوں ہے:

چھچھ ہزارے کنکاں چنگیاں، دھنی کھوب گائیں
سور سیکرتی گھوڑ بھلے، ہشت نگر کے دھائیں [۳]

چھچھ کی وجہِ تسمیہ کے بارے میں متعدد روایات ملتی ہیں،جیسے:

الف:''چھچھ کی ظاہری صورت چھاج سے مشابہ ہے،اس لیے اسے چھاج،چھج کہا جاتا تھا جو رفتہ رفتہ چھچھ بن گیا۔

ب: سندھ کے حکمران راجا داہر کے باپ کا نام راجا چچ تھا،اس نام کی مناسبت سے اس علاقے کا نام چھچھ پڑا۔

ج: بعض روایات کے مطابق چھچھ کا لفظ شش،شاس،چاچ،چھگ،چھپ یا چھاپ کی مبدل صورت ہے۔

د: چھچھ یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دلدلی زمین کے ہیں۔اس علاقے کو یہ نام سکندرِ اعظم نے دیا۔

ان روایات میں مؤخر الذکر زیادہ قرینِ قیاس ہے کیوں کہ دریائے سندھ کی قربت کے باعث چھچھ کی بیش تر زمین دلدلی ہے[۴]۔

چھچھ کا علاقہ شرقاً غرباً ۱۹ میل (لمبائی میں) اور شمالاً جنوباً ۸ میل (چوڑائی میں) پھیلا ہوا ہے۔جغرافیائی طور پر یہ خطہ ۷۲-۱۹ سے ۷۲-۵۳ درجے طول بلد شرقی اور ۳۳-۵۰ سے ۳۳-۵۹ درجے عرض بلد شمالی کے درمیان واقع ہے۔چھچھ کے شمال میں دریائے سندھ،جنوب میں جرنیلی سڑک،مغرب میں اٹک بنارس کی پہاڑیاں اور مشرق میں گندگر پہاڑ ہے جو اسے ہزارہ سے جُدا کرتا ہے۔چوراسی دیہات پر مشتمل اس علاقے کا مرکزی قصبہ حضرو ہے۔خواجہ محمد خان اسدؔ کے بہ قول:

* پروفیسر،شعبۂ اردو،علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی،اسلام آباد

چھچھ کا پُرانا نام 'چھچھ چوراسی' ہے کیوں کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے اس کے چوراسی دیہات تھے [۵]۔

چھچھ کی زمین زرخیزی میں اپنی مثال آپ ہے۔ دریائے سندھ کی قربت کے باعث یہاں گندم، مکئی، گنا، تمباکو اور چنے کی فصلیں اور مختلف سبزیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں جو اپنے ذائقے اور معیار کے اعتبار سے دور و نزدیک میں شہرت رکھتی ہیں۔ منشی امین چند ڈیڑھ سو سال پہلے اپنے سفر نامے میں اس خطے کی زرخیزی کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:

> علاقہ چھچھ ایک ہموار میدان ہے۔ پیداواری میں بڑا کامل اور زمین وہاں کی اکثر چاہی ہے بل کہ تمام ضلع (اُس وقت یہ علاقہ راول پنڈی کے ضلعے میں شامل تھا) میں اس علاقے کے برابر دوسرا کوئی علاقہ اچھا نہیں ہے۔ باقی تمام ضلع میں یا تو پہاڑ ہے یا نشیب و فراز ہے، غرض کہ اس چھچھ کے برابر کوئی کوئی مسطح قطعہ میدان کا نہیں اور یہاں کی ایک نقل مشہور ہے، وہ یہ ہے: چھچھ ماں سمندر کی جو مانگے سو لے [۶]۔

جرنیلی سڑک (جی ٹی روڈ) اور دریائے سندھ کے درمیان آباد چھچھ کا یہ زرخیز علاقہ تاریخی، تہذیبی اور علمی حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ علاقہ یونانیوں سے لے کر افغانیوں تک اکثر حملہ آوروں اور طالع آزماؤں کی گذرگاہ رہا ہے۔ کئی خوں ریز معرکے اور جنگیں اس دھرتی پر لڑی گئیں۔ ۱۰۰۸ء میں سلطان محمود غزنوی اور راجا انند پال کے درمیان ایک فیصلہ کن معرکہ چھچھ کے میدان میں ہوا جس میں انند پال کو شکستِ فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ مغلیہ عہدِ حکومت میں یہ خطہ خاص طور پر مرکزِ نگاہ رہا۔ اکبرِ اعظم نے ۱۵۸۱ء میں دریائے سندھ پر ایک عظیم الشان قلعہ بنوایا تا کہ افغانوں کی شورش کو کچلا جا سکے۔ عہدِ اورنگ زیب عالم گیر میں کامل خان قلعہ دار اٹک اور نقلی شاہ شجاع کے درمیان ۱۱۷۷ھ میں ہارون (علاقہ چھچھ) کے مقام پر خوں ریز لڑائی لڑی گئی۔ میدان کامل خان کے ہاتھ رہا اور نقلی شاہ شجاع اور اس کے بہت سے ساتھی تہ تیغ ہوئے۔ بچ کر بھاگنے والے دریائے سندھ کی تیز لہروں کی نذر ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ۱۸۱۳ء میں سکھوں اور افغانوں کے درمیان ایک بڑی لڑائی لڑی گئی جو ''جنگِ اٹک'' کے نام سے مشہور ہے۔ سیّد احمد شہید اور سکھوں کے درمیان کئی جھڑپیں بھی اسی علاقہ میں برپا ہوئیں۔ اس علاقے سے ملنے والے آثارِ قدیمہ سے اس کی قدامت ظاہر ہوتی ہے۔ چھچھ کے علاقے سے ملنے والے دو تاریخی کتبے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ یہ دونوں کتبے خروشتی رسم الخط میں ہیں۔ پہلا کتبہ گڑھی متی سے جب کہ دوسرا کامرہ سے دست یاب ہوا۔ کامرہ سے ملنے والا کتبہ کنشکِ دوم [کنشکا] کی پیدائش سے متعلق ہے۔

علمی اعتبار سے بھی اس خطے کو عزت و توقیر حاصل ہے۔ اس خاک سے ایسے مردانِ خدا اُٹھے جن کے تبحرِ علمی نے ایک عالم کو مستفیض کیا۔ چھچھ کے قریے قریے میں دینی مدارس کی داغ بیل ڈال کر ان مردانِ خدا نے پورے عالم کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ دور دراز سے تشنگانِ علم یہاں کسبِ فیض کے لیے حاضر ہو کر قرآن و حدیث کی روشنی سے قلوب و اذہان کو منور کرتے رہے۔ یہ علاقہ اسی علم و فضل کے باعث ہندوستان کا بخارا کہلاتا رہا۔ ماضی قریب کے اکابر علمائے گرامی میں مولانا عبدالرحمان کامل پوری، مولانا قطب الدین غورغشتوی، شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین غورغشتوی، مفتی محمد عمر شمس آبادی، مولانا عبدالغنی، مولانا قاضی غلام جیلانی شمس آبادی، مولانا زاہد الحسینی، قاضی محمد انوار الحق، مولانا محمد یوسف اور مولانا غلام

اللہ خان شامل ہیں۔اس خطے نے دیگر شعبہ ہائے زندگی میں بھی قدآور اور ممتاز شخصیات کو جنم دیا۔ بھائی بالک سنگھ جنھیں سکھوں کا گیارہواں گُرو کہا جاتا ہے، اسی خطے کے فرزند تھے۔ نام دھاری اور نرنکاری فرقے کے پیشوا کی حیثیت سے انھیں مسندِ تکریم عطا ہوئی۔ نام ور گائیک استاد اعجاز حسین حضروی، ماسٹر کفایت حسین حضروی اور نوازش حضروی کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔ خواجہ محمد خان اسد، حکیم تائب رضوی، منظور عارف، احمد داؤد، احمد جاوید، مشتاق عاجز، مرزا حامد بیگ جیسے شعر و ادب کے ممتاز ستارے اسی خاک سے طلوع ہوئے۔ **سیرِ سوات** کے مصنف حکیم محمد یوسف حضروی کا تعلق بھی اسی علاقے سے ہے۔

[۲]

حکیم محمد یوسف کا تعلق حضرو کے معروف علی زئی قبیلے سے تھا۔ اُن کی بعض تصانیف جیسے: **الطبیب والحکیم، جنگِ رجیع، اسرارِ باہ** وغیرہ میں اُن کے نام کے ساتھ سیّد لکھا ہوا ملتا ہے، جس سے بادی النظر میں ان کا تعلق سادات گھرانے سے ظاہر ہوتا ہے مگر یہ بات درست نہیں۔ کتابوں پر نام کے ساتھ سیّد کا اضافہ غالباً محض تکریم اور عزت کے لیے کیا گیا ہے، چوں کہ یہ کتابیں خود حکیم صاحب کی نگرانی میں شائع ہوئیں، اس لیے یہ کہنا کہ ایسا سہواً ہوا ہوگا، درست نہیں۔ یہ اضافہ ارادتاً کیا گیا ہے تاہم حکیم صاحب کی دوسری کتابوں اور خطوں بل کہ لیٹر پیڈ پر بھی یہ اضافہ دکھائی نہیں دیتا۔ حکیم محمد یوسف کے جدِ کلاں محمد احمد جو ''بابو جی'' کے نام سے معروف تھے، اطرافِ غزنی سے ہجرت کر کے آئے اور علاقہ چھچھ کو اپنا مستقر ٹھہرایا۔ وہ زراعت پیشہ تھے اور عالم بھی۔ دورانِ قیلولہ رانی کھیت کے کناروں پر بیٹھے ہوئے طالب علموں کو درس بھی دیتے جاتے تھے۔ ان کا مزار حضرو کی مشہور مسجد ''کھجور والی'' میں ہے۔ سکندر خان نے اپنی کتاب **دامنِ باسین** میں حکیم یوسف کے بھائی سلیمان خان کے ایک خط کا ذکر کیا ہے جو ان کے مطابق ۱۸۹۰ء میں حکیم یوسف حضروی کو کلکتے بھیجا گیا۔ اس میں اُن کے خاندان کے بعض احوال اور غزنی سے چھچھ ہجرت کی تفصیل مرقوم تھی [۷]۔ سکندر خان کا یہ کہنا کہ ۱۸۹۰ء میں حکیم صاحب کو ان کے بھائی نے خاندانی حالات سے متعلق خط لکھا، درست نہیں۔ یہ خط ۱۹۱۴ء میں لکھا گیا ہوگا کیوں کہ طبی کمیٹی دہلی و لاہور نے کسی اشاعتی منصوبے کے لیے حکیم صاحب سے ان کے خاندانی احوال طلب کیے تھے۔ حکیم صاحب نے اس سلسلے میں اپنے بھائی کو جو خط لکھا، وہ ذیل میں نقل کیا جاتا ہے:

''از دفتر
عین الحسن اکسیری دواخانہ
اسمٰعیل مدن لین نمبر ۲۲، کلکتہ
۳ر مئی ۱۹۱۴ء
بہ خدمت شریف جناب بھائی صاحب، السلام علیکم۔
پہلے ایک لفافہ خدمت شریف میں روانہ کر چکا ہوں، امید ہے ملاحظہ سے گزرا ہوگا۔ اس اثنا میں آپ کا ایک کارڈ

بھی آیا۔ فی الحال ایک اچانک [کذا] امورات ذیل سے مطلع کیجیے:

۱۔ ہمارے خاندان میں کہاں سے لوگ یہاں آ کر سکونت پذیر ہوئے ہیں؟

۲۔ اور ان کے اسمائے گرامی کیا تھے؟

۳۔ دُنیاوی زندگی اور وسائلِ آمدنی کیا تھے؟

۴۔ اور والد صاحب تک سلسلہ بہ سلسلہ اُن لوگوں کے نام۔

۵۔ اُن لوگوں میں کون کون شخص عالم، فقیر، درویش، کامل، صاحب دل گزرے ہیں؟

۶۔ اور ان سے کوئی کرامات یا ولایت زندگی میں یا بعد از وفات ظہور میں آئی ہوں، وہ واقعات یا تذکرہ مختصر لفظوں میں۔

۷۔ اس ملک میں آنے پر کسی زمانہ [زمانے] کے بادشاہوں سے ربط ضبط یا کوئی تعلق رہا ہو، اُس کا تذکرہ۔

۸۔ حضرو بابا اور حضرو اور حضرو خیل میں نسبتِ لفظی، اُس کی پوری تشریح۔

۹۔ حضرو بابا کے مزار کے پاس طوفانِ اباسین کا نہ آنا یا وہ واقعات کہ مزار کی گھاس، بخار والا ہاتھ پر اُس کو باندھے تو بخار جاتا رہے، کہاں تک صحیح ہیں؟ یا بچوں کی آنکھ کو اچھا کرنا یا اور کوئی خاندانی واقعہ عجیب وغریب ہو تو وہ بھی ضرور لکھیے گا، سب صحیح صحیح اور ٹھیک ہوں۔ یا چچا عبدالقدیر صاحب کے انتقال پر جنوں کا رونا اور بھی بزرگوں کے واقعات مشہور معروف ہوں، ضرور لکھیے گا اور بہت جلد جواب دے کر سرفراز کیجیے کیوں کہ طبی کمیٹی لاہور و دہلی میں صحیح صحیح نسب نامہ اور جو سوال میں نے آپ کو لکھے ہیں، اُس کے متعلق صحیح صحیح جواب طلب کیے ہیں۔ جواب جانے پر طبی کمیٹی میں چھپ کر شائع ہوں گے۔ چوں کہ یہ باتیں آپ کو ہم سے زیادہ معلوم اور موقف [کذا] ہیں جو نہیں معلوم وہ والد صاحب و چچا صاحب و دیگر صاحبوں سے دریافت کر کے تشفی بخش جواب دے سکتے ہیں، اس لیے فوراً تحریر فرما دیں۔ ۱۵ رمئی تک سب جوابات طبی کانفرنس میں جائیں گے، غفلت و سستی کو راہ نہ دیں۔ فقط

۸ محمد یوسف عفی عنہ''

حکیم محمد یوسف حضروی کے والدِ گرامی کا نام محمد حسن اور دادا کا نام محمد سعید تھا۔ آپ ۱۸۵۵ء (۹) میں حضرو میں پیدا ہوئے۔ اُن کے ابتدائی حالاتِ زندگی اور تعلیم و تربیت کے بارے میں کُچھ معلوم نہیں۔ ان میں حکمت کا شوق کیسے پیدا ہوا؟ انھوں نے حکمت کی ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ انھوں نے کن اساتذہ سے کسبِ فیض کیا؟ کن اداروں میں وہ زیرِ تعلیم رہے؟ ان سب سوالوں کا مستند اور تسلی بخش جواب معلوم نہیں۔ سکندر خان اپنی کتاب میں حکیم یوسف حضروی کی بابت رقم طراز ہیں: ''آپ جامعۂ ازہر کے فارغ التحصیل تھے، دہلی کے طبیہ کالج سے حکمت کی سند لی اور کلکتہ میں ۱۹۴۷ء تک مطب چلاتے رہے''[۱۰]۔

حکیم محمد یوسف حضروی کی ایک تصنیف **جنگِ رجیع** موسومہ بہ بہادر مسلمان کے سرورق پر حکیم صاحب کے نام کے ساتھ ''تعلیم یافتہ افغانستان، ہندوستان، مدینہ منورہ و جامع [جامعہ] ازہر قاہرہ مصر'' سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ہندوستان کے علاوہ افغانستان، عرب اور مصر سے تعلیم حاصل کی۔ سوائے جامعہ ازہر کے کسی ادارے یا درس گاہ کا نام معلوم

نہیں کہ وہ کن اداروں میں زیرِ تعلیم رہے۔ میرے خیال کے مطابق طبیہ کالج، دہلی سے اُن کا حکمت کی سند لینا محلِ نظر ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ جن دنوں حکیم محمد یوسف حضروی کلکتے میں حکمت کرتے تھے، اُن کا طبیہ کالج، دہلی کے ساتھ مضبوط تعلق استوار ہوا اور اس ادارے کے کئی اساتذہ سے اُن کے قریبی دوستانہ مراسم بنے مگر کہیں بھی انھوں نے اپنے آپ کو اس ادارے کا تعلیم یافتہ یا سند یافتہ نہیں لکھا۔ راشد علی زئی نے قدرے مبالغے کے ساتھ اُن کے تعلیمی سفر کی بابت لکھا ہے۔ انھوں نے اگرچہ طبیہ کالج، دہلی میں اُن کی تعلیم کا واضح اشارہ نہیں کیا مگر ''ہندوستان کی مشہور و معروف درس گاہوں'' سے اُن کے کسبِ علم کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں حکمت کی تعلیم کے حوالے سے طبیہ کالج، دہلی بلاشبہ معروف ادارہ تھا، تاہم کوئی واضح شہادت ہاتھ نہیں آتی، جو حکیم صاحب کی طبیہ کالج سے وابستگی کو ظاہر کر سکے۔ راشد علی زئی ان کے علمی سفر کے متعلق رقم طراز ہیں:

> بچپن ہی سے حصولِ علم کا شوق دامن گیر ہوا تو آپ نے کم عمری میں ہی ہندوستان کی مشہور و معروف درس گاہوں کو کھنگال ڈالا مگر حصولِ علم [کذا] کی پیاس نہ بُجھ سکی تو افغانستان و خراسان کے لیے رختِ سفر باندھا۔ وہاں سے علوم و فنون اور طب میں دسترس حاصل کرنے کے بعد علومِ عربیہ و دینیہ میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے حجاز و مصر کے مشہورِ زمانہ جامعات کا رُخ کیا اور ایک مدت تک ان ممالک میں قیام کر کے اپنے شوق کی تکمیل کی[11]۔

راشد علی زئی نے میرے نام اپنے ایک خط میں حکیم صاحب کو دارالعلوم دیوبند کا فارغ التحصیل بھی ٹھہرایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> حکیم صاحب کی پانچ بہنیں اور دو بڑے بھائی تھے۔ سب سے بڑے مولانا عبدالرحمٰن فاضلِ دیوبند تھے۔ وہ حکیم صاحب کو بارہ سال کی عمر میں اپنے ساتھ دارالعلوم دیوبند لے گئے، حکیم صاحب وہاں علومِ اسلامیہ کی تحصیل کے بعد حضرو واپس چلے آئے اور جلد ہی کابل اور حجاز و مصر کی درس گاہوں میں جا کر کسبِ فیض کیا[12]۔

دارالعلوم دیوبند سے حکیم صاحب کا تعلیم حاصل کرنا بھی محلِ نظر ہے۔ یہ محض سُنی سنائی بات ہے جسے کسی مستند شہادت اور واضح ثبوت کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ دارالعلوم دیوبند کا آغاز ۳۱ر مئی ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ اس وقت حکیم صاحب کی عمر گیارہ سال تھی۔ راشد صاحب کے مطابق حکیم صاحب بارہ سال کی عمر میں اپنے بڑے بھائی کے ہمراہ تحصیلِ علم کے لیے دیوبند پہنچے یعنی ۱۸۶۷ء میں، جب دارالعلوم کو قائم ہوئے ابھی محض ایک سال ہوا تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کے بڑے بھائی جنھیں فاضلِ دیوبند رقم کیا گیا ہے، وہ کس زمانے میں دیوبند میں تحصیلِ علم کرتے رہے؟ کیا محض ایک سال میں وہ فاضلِ دیوبند بن گئے تھے؟ پھر یہ کہ دارالعلوم دیوبند سے وابستگی ایک اعزاز سے کم نہیں۔ حکیم صاحب نے اپنی تصانیف و تالیفات اور مضامین و مکاتیب میں کہیں بھی اس عظیم علمی ادارے سے اپنے کسبِ علم کا ذکر نہیں کیا۔ اگر وہ اس ادارے کے فارغ التحصیل ہوتے تو یقیناً وہ افتخار کے ساتھ اس کا کہیں نہ کہیں ذکر کرتے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ حکیم یوسف حضروی حکمت اور دوسرے متداول علوم میں اچھی خاصی دست گاہ رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، پشتو اور اُردو زبان سے اُن کی گہری وابستگی اور مہارت کا اندازہ ان کی تحریروں اور کتابوں سے بہ خوبی

لگایا جاسکتا ہے۔ انگریزی زبان سے بھی انھیں کچھ کچھ آشنائی تھی۔ میرا خیال ہے کہ حکیم یوسف حضروی نے حضرو کے مختلف دینی مدارس سے تعلیم حاصل کی، کیوں کہ اُن دنوں علاقہ چھچھ میں جابہ جا دینی مدارس قائم تھے جن میں قرآن، حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف، لغت، صرف، نحو، رجال، منطق، ادب اور دوسرے شعبوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دُور دراز کے طلبہ ان مدارس میں کسبِ علم کے لیے آتے۔ حکیم یوسف حضروی نے علاقہ چھچھ کے مدارس سے کسبِ فیض کرنے کے بعد سوات اور دوسرے افغان علاقوں کا رخ کیا ہوگا۔ میری اس بات کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ **سیرِ سوات** میں انھوں نے بعض علما سے اپنے تلمذ کا اجمالی ذکر کیا ہے [۱۳]۔ انھوں نے **سیرِ سوات** کے حصّہ دوم میں اُن کے تفصیلی حالات وواقعات بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا مگر افسوس کہ **سیرِ سوات** کا دوسرا حصہ سامنے نہ آسکا اور یوں ان علما کے احوال اور حکیم صاحب کی ان سے کسبِ فیض کی تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ ان علما میں تو روسک کے منطقی مُلا صاحب، کانڑا کے مُلا صاحب، چکیسر کے مُلا صاحب اور ثور ہا کے ضعیف شاہ اخون زادہ صاحب شامل ہیں۔

حکیم محمد یوسف کے حجاز، مصر اور افغانستان کے علمی سفر کے حالات مکمل طور پر پردۂ تاریکی میں ہیں۔ انھوں نے ان دیار وامصار میں کتنا قیام کیا؟ کن علوم وفنون میں مہارت حاصل کی؟ اور کن اساتذہ سے اکتسابِ علم کیا؟ کچھ معلوم نہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے حکمت کا آغاز کہاں سے کیا؟ اور کلکتہ تک کیسے پہنچے؟ ان سوالوں کے جواب میں بھی کوئی مستند شہادت ہاتھ نہیں آتی۔ **فلسفہ شادی** مطبوعہ ۱۹۴۶ء کے ابتدائیے میں حکیم محمد یوسف حضروی نے لکھا:

> راقم الحروف آج اپنی زندگی کی اکانوے منزلیں طے کر چُکا ہے۔ اس نوے سال میں، مَیں نے ہندوستان، افغانستان، خراسان، عربستان، حجاز اور مصر میں اپنی عمر کا ایک اچھا خاصا حصّہ صرف کیا اور تقریباً پچاس سال سے حکمت کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہوں [۱۴]۔

اس عبارت سے دو باتوں کی وضاحت ہوتی ہے۔

اوّل: حکیم صاحب لگ بھگ چالیس سال کی عمر تک مختلف ممالک سے کسبِ علم وحکمت کرتے رہے۔

دوم: انھوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں باقاعدہ حکمت شروع کی۔

۳ر مئی ۱۹۱۴ء میں اُن کی کلکتے میں موجودگی اور ''عین الحسن اکسیری دواخانہ'' کے ساتھ اُن کی وابستگی کا اظہار اُن کے ایک خط سے ہوتا ہے جو پچھلے اوراق میں نقل کیا گیا ہے۔ گمان غالب ہے کہ اس ادارے کے ساتھ ان کی وابستگی بہ طور معاون حکیم کے رہی ہوگی۔ اس ادارے کے ساتھ وہ کب وابستہ ہوئے اور کتنی دیر اس کے ساتھ منسلک رہے؟ اس کے بعد اپنا مطب قائم کرنے تک وہ کن اداروں کے ساتھ بہ طور طبیب اپنی خدمات انجام دیتے رہے؟ ''اکسیراتِ ہند'' کے نام سے کلکتے کی کولوٹولہ اسٹریٹ میں انھوں نے اپنے ذاتی دواخانے کی بنیاد کس سال رکھی؟ ان سوالوں میں سے کسی سوال کا جواب معلوم نہیں۔ اس میں شُبہ نہیں کلکتے کے ممتاز حکما میں اُن کا شمار ہوتا تھا اور شہر کی ممتاز شخصیات، حکما اور شعر وادب سے

وابستہ افراد کے ساتھ اُن کے دوستانہ مراسم تھے۔ وہ طبی کانفرنسوں میں نہ صرف شریک ہوتے بل کہ مقالات بھی پیش کرتے، جو اکابر حکما کی نظر میں داد و تحسین کے سزاوار ٹھہرتے۔ آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس، دہلی کے زیرِ اہتمام حیدر آباد دکن میں منعقدہ کانفرنس ۱۹۲۳ء میں روح کی حقیقت کے عنوان سے حکیم یوسف حضروی کے مقالے پر انھیں ''تمغا'' پیش کیا گیا۔ اسی طرح اُن کی محققانہ تصنیف اسرارِ باہ پر آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس، دہلی کی جانب سے ۱۹۲۹ء کی طبی نمائش میں سند پیش کی گئی۔ حکیم محمد یوسف حضروی بنگال کی جنرل کونسل اینڈ اسٹیٹ فیکلٹی آف یونانی میڈیسنز کے ممبر بھی رہے اور مختلف ریاستوں کے شاہی طبیب بھی۔ نامی گرامی رؤسا اور نوابین کے معالج خاص ہونے کی وجہ سے دُور و نزدیک میں اُنھیں عزت حاصل تھی۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں کلکتے سے ایک ماہ وار طبی رسالے **شفا** کا اجرا کیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا مصور طبی رسالہ تھا۔ یہ رسالہ کتنا عرصے باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا، معلوم نہیں۔ راقم کی نظر سے **شفا** کا محض ایک شمارہ بابت جولائی، اگست ۱۹۲۶ء گزرا ہے۔ رسالہ اپنے مندرجات، پیش کش اور طباعت کے اعتبار سے معیاری ہے۔ مولوی ریاست علی ندوی، حکیم غلام کبیر خان، حکیم سید ریاضت حسین، حکیم کبیر الدین اور حکیم غلام محمد ناظم کے وقیع مقالاتِ حکمت کے ساتھ خود ایڈیٹر کے چار پانچ مقالات شاملِ رسالہ ہیں۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ **شفا** کو اپنے عہد کے ممتاز ادبا اور حکما کا تعاون حاصل رہا۔ **شفا** کے حوالے سے راشد علی زئی رقم طراز ہیں:

> کلکتہ کے اس قیام کے دوران ہی حکیم یوسف حضروی نے طب کے موضوع پر ایک منفرد اور اچھوتا ماہ نامہ شفا مارچ ۱۹۲۶ء میں جاری کیا اور جب تقسیمِ ہند کے بعد آپ ۱۹۵۱ء میں کراچی آ گئے تو یہاں سے بھی شفا کا سلسلۂ اشاعت جاری رہا[۱۵]۔

راشد علی زئی نے راقم کے نام اپنے ایک خط میں یہ انکشاف بھی کیا:

> حکیم محمد یوسف حضروی میرے والدِ گرامی خواجہ محمد خان اسدؔ کے رشتے میں نانا بنتے تھے اور والدِ گرامی کی علمی دل چسپی کے پیشِ نظر ان سے خصوصی برتاؤ کرتے تھے۔ آپ ۱۹۵۰ء میں کلکتہ سے ہجرت کر کے کراچی وارد ہوئے تو وہاں اپنا رسالہ شفا جاری کیا تو والدِ گرامی کو کراچی بلا کر اس کا مدیر مقرر کر دیا مگر یہ سلسلہ چند ہی ماہ چل سکا اور والدِ محترم واپس حضرو تشریف لے آئے[۱۶]۔

سکندر خان نے حکیم صاحب کا سالِ ہجرت ۱۹۴۷ء تحریر کیا ہے۔ راشد علی زئی نے اپنے مضمون میں ۱۹۵۱ء اور میرے نام اپنے خط میں ۱۹۵۰ء تحریر کیا ہے۔ حکیم صاحب کا کلکتے میں چوں کہ بڑا مطب تھا، اس لیے گمانِ غالب ہے کہ اس کو کو سمیٹنے میں کچھ وقت ضرور لگا ہوگا۔ اس لحاظ سے حکیم صاحب کا ۱۹۴۷ء میں ہجرت کرنا محلِ نظر ہے۔ انھوں نے کس سال ہجرت کی؟ اس کے بارے میں بھی کوئی مستند شہادت ہمیں دست یاب نہیں۔ تاہم خواجہ محمد خان اسدؔ کے نام ۲۲ مئی ۱۹۵۰ء کو انھوں نے کراچی سے ایک خط لکھا جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مئی ۱۹۵۰ء سے قبل کراچی آ گئے تھے۔ پاکستان میں **شفا** کے اجرا کی بابت بھی کوئی ٹھوس شہادت ہمارے ہاتھ نہیں لگی۔ راقم نے نامی گرامی اطبا اور حکما سے اس رسالے کی

بابت استفسار کیا اور کراچی کی بڑی لائبریوں اور کتب خانوں میں بھی اسے تلاش کیا مگر اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ خواجہ محمد خان اسدؔ اپنی کتاب دوستی کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں، اگر وہ کُچھ عرصے اس رسالے کے مدیر رہے ہوتے تو اُن کے کتب خانے میں ان کے زمانہ ادارت کے **شفا** کے پرچے ضرور موجود ہوتے۔

حکیم محمد یوسف حضروی نے ہجرت کے بعد کراچی کو اپنا مستقر ٹھہرایا اور وہاں اکسیراتِ حضروی دواخانے کے بنیاد رکھی۔ پیرانہ سالی میں ایک نئی جگہ پر دواخانے کو چلانا مشکل کام ہے تاہم حکیم صاحب نے جوں توں کر کے پانچ سات سال دواخانے کا سلسلہ قائم رکھا۔ وفات سے کُچھ عرصے پہلے وہ سب کُچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے آبائی علاقے حضرو آ گئے اور یہیں ایک سو پانچ سال کی عمر میں ۸ر دسمبر ۱۹۵۹ء کو راہیِ ملکِ بقا ہوئے۔ انھیں حضرو کے معروف ''بنی والے قبرستان'' میں دفن کیا گیا۔

حکیم صاحب کی اولاد میں دو بیٹے اور دو بیٹیاں شامل ہیں۔ بڑے صاحب زادے کا نام محمد احسن تھا جو پیشے کے لحاظ سے انجینئر تھے۔ انھوں نے زندگی کا بڑا حصہ انگلینڈ میں بسر کیا اور وہیں وفات پائی۔ دوسرے بیٹے کا نام محمد قاسم ہے جو پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے اور زندگی کا ایک طویل عرصہ انگلستان میں قیام پذیر رہے۔ ان کا انتقال نومبر ۲۰۱۸ء میں انگلستان ہی میں ہوا۔ حاجی سکندر خان کے بہ قول معروف امریکی سلسلہ سوانحی فرہنگ: *Who is who in the World* میں انھیں دُنیا کے دس بڑے ماہرینِ نفسیات میں شمار کیا گیا ہے [۱۷]۔ حکیم محمد یوسف کی بڑی بیٹی جمیلہ بیگم کا حضرو میں بیاہ ہوا، چند سال پہلے انھوں نے حضرو سے کراچی نقلِ مکانی کی ہے۔ حکیم صاحب کی یہ بیٹی ابھی حیات ہیں۔ دوسری بیٹی حمیدہ بیگم اقتصادیات میں ایم اے تھیں۔ کراچی میں اپنے شوہر کے ساتھ ہفت روزہ *Trade Ways* سے منسلک رہیں، ان کا بھی انتقال ہو چکا ہے [۱۸]۔

حکیم یوسف حضروی صفِ اوّل کے طبیب تھے۔ اُن کا شمار اپنے وقت کے اہم اطبا میں ہوتا ہے۔ جدید انداز کے مطب کی ہمہ وقت دیکھ بھال اور ہر روز بیسیوں مریضوں کے معائینے اور علاج معالجے کے ساتھ ساتھ وہ تصنیف و تالیف سے بھی غافل نہ رہے۔ انھوں نے حکمت کے مختلف موضوعات پر جو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں وہ حکمت کے ساتھ اُن کے غیر معمولی شغف کی غماز ہیں۔ انھوں نے اپنے ذاتی تجربے اور مشاہدے کے ساتھ ساتھ کتبِ حکمت کے مطالعے اور محققانہ عرق ریزی سے کام لے کر اپنی کتابوں کو گراں بہا اور نافع بنانے کا جتن کیا ہے۔ انھی اوصاف کی بدولت اُن کی کتابوں کو طبقۂ حکمت میں وقعت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا اور نامی گرامی اطبا نے ان کی کتب کو پسندیدگی اور تحسین کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا اندازِ نگارش علمی اور ادبی ہے۔ برمحل آیاتِ قرآنیہ، احادیثِ نبویہ، اشعار، ضرب الامثال اور اقوالِ حکما سے وہ اپنی تحریر کو سجاتے، سنوارتے اور پُرتاثیر بنانے کے ہُنر سے آگاہ تھے۔ ان کی معلوم تصانیف کا اجمال میں تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ یونانی دواسازی: یہ کتاب پہلی بار ۱۹۲۶ء سے قبل کلکتے سے شائع ہوئی۔ جولائی، اگست ۱۹۲۶ء کے شفا میں مطبوعہ ایک اشتہار میں حکیم یوسف حضروی کے نام کے ساتھ مصنف یونانی دواسازی تحریر ہے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن لیتھو آرٹ پریس، کراچی سے ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا۔ ۱۳۶ صفحات پر مشتمل اس مختصر کتاب میں یونانی دوا سازی کے معیاری طریقے درج کیے گئے ہیں۔ اسے فنِ یونانی دواسازی کے موضوع پر پہلی کتاب قرار دیا گیا ہے۔

۲۔ تحقیقِ تپ دق: یہ کتاب بھی ۱۹۲۶ء سے قبل منصۂ شہود پر آئی۔ سِل یا تپ دق اُس عہد کا عام مرض تھا۔ حکیم صاحب نے اپنے تجربات کی روشنی میں اس مرض کی علامات اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی ہیں۔ اس کے اصولِ علاج اور مجرب نسخہ جات بھی شاملِ کتاب ہیں۔ یہ کتاب بھی ان کی محققانہ عرق ریزی کا آئینہ ہے جسے قبولِ عوام وخواص کی سند حاصل ہوئی۔

۳۔ جنگِ رجیع موسومہ بہ بہادر مسلمان: رجیع کے مقام پر حضرت خبیبؓ کی شجاعت و بہادری کا واقعہ نہایت پُردرد انداز میں قلم بند ہوا ہے۔ کتاب ستر صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب پر سالِ تصنیف و اشاعت درج نہیں تاہم ۱۹۲۶ء سے قبل اکسیراتِ ہند دواخانہ کلکتہ سے شائع ہوئی۔

۴۔ اسرارِ باہ (خورد): یہ کتاب ۱۳۴۶ھ بہ مطابق ۱۹۲۷ء اکسیراتِ ہند دواخانہ، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ ۲۲۰ صفحات کی اس کتاب میں موضوع کے جملہ پہلوؤں پر اجمالی بحث کی گئی ہے اور مجرب نسخہ جات اور طریقِ علاج کو عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

۵۔ اسرارِ باہ (کلاں): اسرارِ باہ کے موضوع پر یہ اُن کی دوسری کتاب ہے جو پہلی کتاب کے مقابلے میں تقریباً چار گُنا ضخیم ہے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن ایک ہزار کی تعداد میں کلکتے سے شائع ہوا اور اس کے قبولِ عام کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ محض ایک سال کے عرصے میں اس کی ایک ہزار جلدیں نکل گئیں۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں حکیم یوسف حضروی کی محققانہ عرق ریزی کا اظہاریہ ہے۔ اہلِ علم اور حکماؔ نے اس کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور آل انڈیا ویدک اینڈ یونانی طبی کانفرنس، دہلی نے اسے مستند کتاب قرار دیتے ہوئے سند سے نوازا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن اضافوں اور تبدیلیوں کے ساتھ ۱۳۵۲ھ بہ مطابق ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ عربی کے پروفیسر مولانا فضل الرحمٰن اور حکیم محمد صادق نے اس کے قطعاتِ تاریخ رقم کیے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی جانب سے کتاب مذکور کا قطعۂ تاریخِ طباعت ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

مرے مہرباں یوسفِ حضروی
ہیں بے شک طبیبِ حذاقت پناہ
خدا اُن کو رکھے کہ اُن کا وجود

مریضوں پہ ہے ایک فضلِ الٰہ
انھوں نے لکھی ہے یہ نادر کتاب
جو ہے ذوقِ طبی پہ اُن کے گواہ
وہ موضوع جو زیرِ بحث اس میں ہے
بہت اس میں گہری ہے اُن کی نگاہ
ہوئی طبعِ ثانی کی تاریخ یہ
عجب کنزِ مخفیِ اسرارِ باہ
۱۳۵۲ھ

۶۔ مرنے کے بعد کیا ہو گا: یہ کتاب چہ ۱۹۳۲ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ **نگار** بابت اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مشیر احمد دہلوی کے مضمون مرنے کے بعد کیا ہو گا پر نیاز فتح پوری نے ایک نوٹ تحریر کیا جس میں حیات بعد الممات یا معاد کی حقیقت سے انکار کیا گیا تھا۔ حکیم محمد یوسف حضروی نے علامہ نیاز فتح پوری کے مضامین اور تحریروں سے اُن کے انکارِ معاد کا رد پیش کیا ہے۔ اس پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے ہفت روزہ **سچ**، لکھنؤ بابت ۱۰ر فروری ۱۹۳۳ء میں مختصر تبصرہ تحریر کیا، مولانا کا یہ تبصرہ درجِ ذیل ہے:

> مرنے کے بعد کیا ہو گا: از حکیم محمد یوسف صاحب، مدیر شفا کولوٹولہ کلکتہ۔ ۳۲ صفحے۔ غالباً مفت ملے۔ نیازؔ فتح پوری کے ایک مضمون کا دل چسپ جواب، جس میں نیازؔ نے حقیقتِ معاد سے انکار کیا تھا، زیادہ تر جوابات خود نیازؔ ہی کے اقوال سے دیے گئے ہیں[19]۔

۷۔ الطبیب والحکیم (خیالاتِ زریں): یہ کتاب چہ اعلیٰ حضرت نواب بہادر کیپٹن خواجہ حبیب اللہ صاحب نواب ڈھاکا کے علومِ شرقیہ اور علمِ حکمت پر زریں خیالات یا اقوال کا حامل ہے۔ نواب موصوف کے خیالات کو حکیم محمد یوسف حضروی نے کتابچے کی صورت میں مرتب کیا ہے۔ کتاب چہ ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کی اشاعت بھی اکسیراتِ ہند، کلکتہ سے ہوئی۔ سالِ اشاعت درج نہیں۔

۸۔ فلسفہ شادی: یہ مختصر سی کتاب زن وشو کے تعلقات اور ازدواجی زندگی کی اہمیت، شادی کی ضرورت اور اس کے تقاضوں پر نہایت آسان زبان اور عام فہم اسلوب میں لکھی گئی ہے۔ ہندوستان میں کم عمری کی شادی اور زن وشو کے درمیان بگاڑ کے مختلف اسباب وعوامل کو عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور بہتر ازدواجی زندگی گزارنے کے اصول اور آداب بتائے گئے ہیں۔

۹۔ سیرِ صوات (حصہ اوّل): سیرِ سوات حکیم محمد یوسف کا سوات کا سفر نامہ ہے۔ حکیم صاحب نے سوات کو

عنوانِ کتاب میں ہی نہیں بلکہ ہر جگہ ''صوات'' لکھا ہے۔ یہ سفر ۱۹۴۴ء کے موسمِ گرما میں ہوا۔ حکیم صاحب نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ اپنے سفر کے احوال اور سوات کی تہذیب وثقافت کو اس کتاب میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ انھوں نے ریاست کے بادشاہ، ولی عہد اور دیگر اہم شخصیات سے ملاقاتیں بھی کیں اور ریاست کے انتظام اور والیانِ ریاست کے اندازِ حکمرانی پر بھی اپنے تأثرات پیش کیے۔ یہ سفر نامہ زبان و بیان اور اپنے اسلوب کے اعتبار سے بھی حکیم صاحب کی دوسری کتب سے ممتاز ہے اور اس میں ان کی اُردو، فارسی اور عربی شاعری کے نمونے بہ صورتِ قصائد موجود ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں اکسیراتِ ہند، کلکتہ سے شائع ہوئی۔ کتاب کے آخر میں اس کے حصّہ دوم کی نوید سُنائی گئی ہے مگر بعد میں **سیرِ سوات** کا حصّۂ دوم شائع نہ ہو سکا۔

حکیم محمد یوسف حضروی نے اس کے علاوہ کیا کُچھ لکھا، معلوم نہیں۔ کلکتے سے کراچی منتقلی اور پھر وہاں سے حضرو نقلِ مکانی میں شاید اُن کے مسودات اور کتابیں ضائع ہو گئی ہوں یا ان کے سامان اور کاغذات میں کہیں دبی رہ گئی ہوں، ہمیں اُن کی کُچھ خبر نہیں۔ راشد علی زئی صاحب حضرو میں ان کے عزیز و اقارب سے رابطہ کرتے رہے مگر انھیں اس ضمن میں کامیابی نہ ہو سکی۔ وہ اپنے ایک مضمون میں اپنی ناکامی کا ذکر قدرے درشت انداز میں اس طرح کرتے ہیں:

> افسوس! حکیم حضرویؒ کے بے شمار مقالاتِ نظم ونثر [کذا] اور طبی نسخہ جات کے ساتھ ساتھ کئی مسودات اور دوسری چیزیں اُن کے گھر کی الماریوں میں پڑے پڑے دیمک اور کیڑے مکوڑوں کی نذر ہو رہے ہیں مگر اُن کی پڑھی لکھی اولاد کو اس بات کا قطعی کوئی احساس نہیں ہے۔ میری کئی دفعہ کی درخواست کے باوجود ان الماریوں کے تالے نہیں کُھل سکے [۲۰]۔

[۳]

سیرِ سوات حکیم محمد یوسف کی کم وبیش ایک ماہ کی سیاحتِ سوات کا خوش نما آئینہ ہے۔ اس آئینے میں حکیم صاحب کے احوالِ سفر کی رنگا رنگ تصویریں، اُن کے مشاہدے کی دل پذیر جھلکیاں، سوات کے قدرتی مناظر کا حسنِ دل آویز اور والیان وساکنانِ ریاست کے حسنِ سلوک اور رنگِ تواضع کے واقعات پوری صفائی کے ساتھ دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سفر ۸/ جون ۱۹۴۴ء میں حضرو سے آغاز ہوا اور ایک ماہ کے بعد حضرو ہی میں اپنے انجام کو پہنچا۔ اس سفر میں حکیم محمد یوسف حضروی کے ساتھ اُن کے ایک ملازم اور ایک دوست حافظ غلام عمر شریک تھے۔ حکیم صاحب کے بہ قول یہ ایک معمولی سفر تھا مگر دوست احباب کے مسلسل اصرار اور تقاضوں کے باعث انھوں نے چشم دید واقعات اور سفر کی کیفیات کو **سیرِ سوات** کی صورت میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس سفر نامے کو قلم بند کرنے کی دوسری بڑی وجہ وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ متعصب ہندو، مغربی مصنفین اور عام نفرت آفریں صحافتی واخباری دُنیا مسلمانوں بالخصوص صوبہ سرحد کے غیور اور بہادر پٹھانوں کے خلاف اپنی کتابوں اور سفر ناموں میں زہر افشانی کر کے اُن کے اوصاف کو دبانے اور اُن کی خرابیوں کو نمایاں کرنے کا جتن کرتے

ہیں جو سراسر تعصب اور بد نیتی کا مظہر ہیں۔ان کا خیال ہے:

> ہم نے جو کچھ بھی اس کتاب میں پیش کیا ہے،اس کے متعلق ہمارا یقین ہے کہ قارئین کے دل میں پٹھانوں کی تہذیب و شائستگی و رواداری کے جو اثرات ثبت ہوں گے وہ ان سے بالکل مختلف ہوں گے جو متعصب غیر مسلم سیّاح یا مغرب کے عام اخبار و تصنیفات نے دلوں پر نقش کر دیے ہیں[۲۱]۔

حکیم محمد یوسف حضروی کے نزدیک سیاح کا عمومی فرض ہے کہ دیانت داری اور سچائی کے ساتھ وہ تمام حالات و واقعات،عوام کے فوائد کے لیے منظرِ عام پر لائے جو کسی ملک یا قوم کے متعلق اُس نے معلوم کیے ہوں۔انھوں نے اسی نقطہ نظر کے تحت اپنے سفر نامے میں ریاست سوات کے جغرافیائی،تمدنی،سیاسی،معاشرتی اور انتظامی حالات کو پیش کرنے کی سعی کی ہے وہ اپنے اس سفر نامے کے حوالے سے خود رقم طراز ہیں:

> سیر یا سفر نامے میں جس قسم کی اطلاعات لازمی اور ضروری ہوتی ہیں مثلاً ملک کے حالات،انتظام کا طریقہ،عدالتی نظام،کیفیت و اصولِ تجارت،عمارات،رسم و رواج،تمدن و معاشرت،درس و تدریس کے قواعد وغیرہ،اگرچہ اس تفصیل کے ساتھ اس میں موجود نہیں ہیں،جتنے ہونے چاہییں،پھر بھی ان حضرات کے لیے جنھیں اسلامی ممالک کے معمولی واقعات سے بھی دل چسپی ہے،ان کی خدمت میں خصوصاً اور دیگر قارئینِ عظام کی نگاہوں کے سامنے عموماً یہ ماحضر پیش کیا جا سکتا ہے[۲۲]۔

سیرِ سوات میں شامل منظومات سے حکیم یوسف حضروی کی شعری استعداد اور قدرتِ کلام کا اظہار ہوتا ہے۔انھوں نے عربی،فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ شعر کہے ہیں۔افسوس! کہ ان منظومات کے علاوہ اُن کے شعری آثار وقت کی گرد میں گُم ہو چکے ہیں۔معلوم کلام سے اُن کی کہنہ مشقی اور پُر گوئی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔سیرِ سوات میں ایک فارسی منظومہ سوات کے عنوان سے ہے جس میں سوات اور والیِ سوات کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔سترہ اشعار کا ایک اُردو قصیدہ ولی عہد بہادر عبدالخالق جہاں زیب کی مدح میں ہے۔**سیرِ سوات** بھی انھی کے نامِ نامی سے منتسب کی گئی ہے۔ایک عربی قصیدہ والیِ سوات کی مدح میں ہے جو بیس اشعار پر مشتمل ہے۔اُردو میں بھی دس مدحیہ اشعار والیِ ریاست کی شان میں کہے گئے ہیں۔ذیل میں متذکرہ بالا چاروں منظومات سے بہ طور نمونہ چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں تا کہ حکیم محمد یوسف حضروی کی شعری صلاحیت اور قدرت کا اندازہ لگایا جا سکے:

سوات

اے سوات اے مہرِ عالم تابِ علم
صبح بیدار از تو شامِ خوابِ علم
آستینت مخزنِ جود و کرم
آستانت مرجعِ اربابِ علم

ذرۂ صحرائے تو خورشیدِ فضل
قطرۂ دریائے تو سیلابِ علم[۲۳]

قصیدہ در مدح حضور فیض گنجور ولی عہد بہادر جناب عبدالخالق جہاں زیب

پس از ثنائے خدائے قدیر ورب غفور
و بعدِ نعتِ رسولِ امیں سراپا نور
قلم پہ فرض ہوئی مدح عبدِ خالق کی
سوات کے ہیں ولی عہد جو بہت مشہور
یہ کروفر،یہ تجمل، یہ شان اور یہ شکوہ
کہاں گئے جم و دارا و قیصر و فغفور
کہاں ہے آج سکندر یہ شوکتیں دیکھے
جو اپنے جاہ و تجمل پہ تھا بہت مغرور
وہ بارگاہِ بلند احتشام ہے اس کی
کہ بارگاہ سکندر ہے پست جس کے حضور
شجاعت ایسی کہ شیروں میں دھاک ہے جس کی
زبانِ تیغ پہ جرأت کا اس کی ہے مذکور
کیا وہ صاحبِ اقبال حق تعالیٰ نے
کہ گردنیں رہی خم،سرکشوں کی، جس کے
حضور[۲۴]

قصیدہ فی مدحِ والیِ سوات دام ظلہ'

حَمِدْتُ اللّٰہ ۔ ذُوالُّطفِ الْمَدِید
ھُوَ الصَّمَدُ المُھَیْمِنُ لَلْعَبِید
اُصَلِّی بَعْدَہ' اَعدَادَ رَمْلٍ
عَلیٰ خَیرِ النبیینَ الفَرِید
فَبَعْدَ الحَمدِ
وَالصَّلَواتِ طُرّاً

سَاَذْکُرُ مَن یَّبَعَّدُعَنْ نَدِیۡدٍ
رَعَایَاہُ لَدَیۡهِ فِیۡ ابْتِهَاجٍ
وَکُلِّ النَّاسِ فِیۡ عَیۡشٍ رَغِیۡدٍ
حَلَیۡم'' عَادِل'' ذُومَکرُمَاتٍ
کَرِیم'' مُّکرَم'' عِنۡدَ الۡمَجِیۡدِ۲۵

درمدحِ والیِ ریاست

وہ آسماں وقار، مہ اوجِ سروری
جس کی نظر ہے مائلِ انصاف گستری
وہ نیّرِ جہانِ کمالاتِ کشوری
شرمندہ جس کے سامنے بختِ سکندری
نام اُس کا خاص و عام میں عبدالودود ہے
حاصل اُسے رضائے خدائے ودود ہے
ذروں کو اس نے نور سے معمور کردیا
ملکِ سوات، جلوہَ گہ طور کردیا
دربار اُس کا مرجعِ اہلِ کمال ہے
ہر ایک علم و فن میں عدیم المثال ہے۲۶

حکیم محمد یوسف حضروی اگرچہ با قاعدہ ادیب نہیں تھے مگر شعر و ادب کے گہرے وقوف اور عربی و فارسی کے بسیط مطالعے نے اُن کی تحریر کو ادبی دل کشی اور شاعرانہ جاذبیت عطا کی ہے۔ اُن کا اسلوبِ نگارش خوش رنگ اور پُر تاثیر ہے۔ اُن کے سفر نامے میں کہانی کا سا بہاؤ ہے اور وہ چھوٹے چھوٹے جملوں میں پیش آمدہ مناظر اور واقعات کو خوش نما اسلوب میں بیان کرتے ہیں جو قاری کی توجہ کو اِدھر اُدھر نہیں ہونے دیتا۔ کہیں کہیں اُن کے اسلوب میں طنز اور ظرافت کا رنگ شامل ہو کر اُن کے رنگِ تحریر کو مزید دل کشی عطا کرتا ہے۔ اُن کے اس اسلوبِ خاص کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

> اس ملک کی زمین کے متعلق فرشِ گل کا تخیل ایک ادنیٰ تخیل ہے۔ اگر کہیں اس فرشِ زمردیں پر نسیمِ نکہت بار شوخیاں کرتی پھرتی ہے تو دوسری طرف جب قطرہ ہائے شبنم اُچھل اُچھل کر فرش پر گرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عروسِ فطرت کا ہار ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا ہے اور غیر مقدس ہاتھوں سے محفوظ رکھنے کے لیے زمین اپنے سینے میں

جذب کر رہی ہے ۲۷۔

نوشہرہ چھاؤنی کی دل کشا سڑکیں، کناروں پر کوٹھیاں اور خوب صورت بنگلے، سڑک کے کناروں پر جگہ جگہ پھولوں کی کیاریاں، سرو اور شمشاد کے درختوں کی نگاہ پرور قطاریں اور صبح کے وقت اُن کی سرسبزی اور شادابی دیکھ کر بے ساختہ انسانی دماغ کی جدوجہد کی داد دینی پڑتی تھی۔ جس وقت تانگا دریائے کابل کے سینے پر سے کشتیوں کے پُل کے ذریعے عبور کر رہا تھا اور ہوا، آبِ سرد میں نہائی ہوئی ہم لوگوں کے چہروں سے مَس ہوتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ہم لوگ بہشتی ہواؤں کے نمونے دیکھ رہے ہیں۔ سرد ہوا کی اٹھکھیلیاں، طبیعت میں شگفتگی، روح میں بالیدگی، خیالات واحساسات میں تازگی پیدا کر رہی تھی اور کچھ دیر کے لیے ہم کل کی آتش باری اور شب کی گرمی کے تمام مصائب فراموش کر چکے تھے ۲۸۔

حافظ صاحب نے سلام وکلام کے بعد کمرے کے متعلق کہا اور انھوں نے فوراً اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ یہ پھاٹک والا کمرہ دے دو کیوں کہ اور کمروں کے مقابلے میں یہاں زیادہ آرام ملے گا۔ چناں چہ وہ مقفل کمرا، جسے کمرا کہنا بھی توہین ہے، جو اپنے [اپنی] ہیئتِ کذائی سے اقطاعِ عالم کی تمام تعمیرات کو یقین دلا رہا تھا کہ میں بھی تاریخِ آثارِ عتیقہ سے قبل کی یادگار ہوں اور صدیاں گزر جانے کے بعد بھی اپنے سمجھ میں نہ آنے والے رنگ وروپ کے ساتھ زمین کا بوجھ بنا ہوا ہوں اور دُنیا کو اپنی قدامت کا ہر وقت یقین دلا رہا ہوں اور اختتامِ کائنات تک یقین دلاتا رہوں گا ۲۹۔

چار باغ سے گزرتے وقت ہماری نظر پڑی تو دُور افق میں قضا گٹ پہاڑ کی بلند ترین اور سیاہ چوٹی ایک خوف ناک انداز سے ہمیں تک رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے پہاڑوں کو طے کرتے ہوئے چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے ختان ٹیلے سے گزرتے ہوئے قضا گٹ پہاڑ کے دامن میں پہنچے ہی تھے اور نہ معلوم کیا کیا سونچ [سوچ] کر خوش ہو رہے کہ یکا یک ایک دھماکہ والی خوف ناک آواز سُنی اور تمام خیالات کا شیرازہ درہم برہم ہو گیا ۳۰۔

حکیم یوسف حضروی کے اس سفرِ سوات کا آغاز حضرو سے ہوا۔ حضرو سے اٹک تک کا سفر تانگہ میں ہوا۔ پانچ گھنٹے میں یہ سولہ میل کی مسافت طے ہوئی۔ راستے کی دشوار گزاری، موسم کی شدت اور لُو کے طمانچوں نے مسافروں کو بے کل کیا۔ یہاں سیٹھ عبدالغنی کے گھر پر ستانے اور آرام کرنے کا پروگرام تھا۔ یہاں کھانا کھایا گیا، آرام کیا گیا اور دریائے سندھ کے ٹھنڈے پانی سے تھکن اور سفر کی صعوبت اُتارنے کا جتن کیا گیا۔ رات کے وقت اٹک سے نوشہرہ کے لیے بہ ذریعہ ریل گاڑی روانہ ہوئے۔ صبح سات بجے نوشہرہ سے پھر تانگے کا سفر شروع ہوا جو مردان جا کر ختم ہوا۔ یہ سفر کل کے مقابلے میں قدرے خوش گوار تھا۔ مردان کے جس ہوٹل میں قیام کیا اُس کی کہنگی اور خستگی نے حکیم صاحب کے ذوقِ نفیس کو مجروح کیا مگر مجبوراً وہیں رات گزارنی پڑی۔ مردان سے گاڑی کے ذریعے وہ ریاست سوات تک پہنچے۔ ریاست کے خوش رنگ مناظر سے بغل گیر ہوئے تو سفر کی تکان پل دو پل میں ہوا ہو گئی۔ حکیم محمد یوسف حضروی کا ریاستِ سوات میں مہینے بھر کا قیام خوش گوار رہا۔ اصحابِ علم وفضل اور رئیسانِ سوات سے دوستانہ ملاقاتوں کے علاوہ ولی عہد بہادر سے ملاقات اور

والیِ ریاست سے خصوصی ملاقاتوں نے حکیم صاحب کو بہت سرشار کیا۔ بے پناہ قدر افزائی اور والہانہ پذیرائی نے انھیں بہت خوش وقت کیا۔ وہ باشندگانِ سوات کی مہمان نوازی، قدر دانی، ریاست کے والیان کی کرم گستری، حسنِ انتظام اور مناظر کی دل پذیری سے خوش ہی نہیں مرعوب بھی دکھائی دیتے ہیں اور جا بہ جا تحسینی کلمات ادا کر کے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔

سیرِ سوات اگرچہ مختصر سا سفر نامہ ہے مگر بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق اس کے آئینے میں ریاستِ سوات کی ایک مکمل اور واضح تصویر دکھائی دیتی ہے۔ سفر نامہ نگار نے محض اپنے سفر کے احوال ہی بیان نہیں کیے بلکہ ریاست کے جغرافیائی، تہذیبی، ثقافتی، علمی، مذہبی، تنظیمی اور معاشی حالات اور اس کے مختلف اداروں کی کارگزاری کا جائزہ بھی پیش کیا ہے۔ حکیم صاحب کی نظر ہر پہلو پر برابر پڑتی ہے اور وہ جزئیات کے ساتھ اس کی کامل تصویر پیش کرتے ہیں۔ ان تصویروں میں اُن کے مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی نمایاں نظر آتی ہے۔ ریاست سوات کے رہنے والوں کے لباس اور پوشاک کے بیان میں وہ رقم طراز ہیں:

> مَردوں کا لباس عموماً طرزِ جدید کی قمیص اور ویسٹ کوٹ، شلوار اور پگڑی اور کلاہ ہوتا ہے۔ بعض لوگ قمیص کی جگہ خلکہ پہنتے ہیں جو لمبائی میں پائے جامہ کے پائنچوں سے ایک بالشت اونچا رہتا ہے اور اس کا گھیرا ڈھائی تین گز کا ہوتا ہے۔ سامنے کے رخ گلے سے نیچے تک کھلا ہوا ہوتا ہے۔ صرف ناف کے قریب ایک بٹن ہوتا ہے اور آستینیں چوڑی ہوتی ہیں۔ اسے وہاں قادری خلکہ بھی کہتے ہیں۔ خلکہ پہننے والے عام طور پر گول پیچک کی طرح سر پر بڑی پگڑی باندھتے ہیں۔ پہلے یہ ململ کے ایک پورے تھان کی ہوتی تھی مگر اب اس میں کسی قدر تخفیف ہوگئی ہے۔ یہ لباس زیادہ تر وہاں کے علما اور خوانین کا ہوتا ہے [۳۱]۔

حکیم صاحب کے نزدیک چوں کہ سفر نامہ نگار کا اولین مقصد ان حالات و واقعات کو صحت اور صفائی کے ساتھ پیش کرنا ہے جن سے وہ دورانِ سفر دو چار ہوا تا کہ قارئین بھی اس علاقے کے حالات و واقعات سے باخبر ہو سکیں۔ اپنے اس خیال کے مطابق انھوں نے اپنے سفر نامے کو معلومات کا گنجینہ بنا دیا ہے۔ یوں اس مختصر سے سفر نامے میں قیامِ پاکستان سے قبل کی ریاستِ سوات کا رقبہ، اس کی آبادی، باشندوں کا رہن سہن، ان کے ملبوسات، اخلاق و عادت، ریاست کے قصبات و شہر، تعلیم، انتظامِ حکومت، عدالت و قوانین، حفظانِ صحت، محکمہ ڈاک و ٹیلی فون، سڑکیں، پُل، محکمہ آب رسانی، فوج، پولیس، مال گزاری، مہمان خانے اور ہم سایہ ریاستوں کے ساتھ تعلقات جیسے موضوعات پر کارآمد اور مفید معلومات جمع کر دی گئی ہیں۔ اُردو سفر نامہ نگاری کی روایت میں اپنی منفرد خصوصیات کے باعث حکیم محمد یوسف حضروی کا سفر نامہ ایک اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ اٹک ڈسٹرکٹ گزٹیئر ۱۹۳۰ء، سی سی گاربٹ، گورنمنٹ پرنٹنگ پنجاب، لاہور، ص ۳۱۸
۲۔ سکندر خان، سوم، ۲۰۰۴ء، بہ حوالہ: دامنِ باسین، ویسا ضلع اٹک؛ ملی کتب خانہ، ص ۴۲
۳۔ آوان، نور بیگ، جنوری، ۱۹۸۱ء، دھرملوکی، لوک ورثہ کا قومی ادارہ، اسلام آباد، ص ۱۰
۴۔ ناشاد، ارشد محمود، دسمبر، ۲۰۰۴ء، چھاچھیولی، پنجابی ادبی سنگت، اٹک، ص ۱۴
۵۔ زئی، راشد علی، ۱۹۹۴ء، مرتب: چھچھ تاریخ کے آئینے میں، مشمولہ: خواجہ محمد خان اسد: احوال و آثار، اسد اکیڈمی، حضرو، ص ۲۶۱
۶۔ منشی، امین چند، بارِ دوم، ۱۸۵۹ء، سفرنامہ، مطبع کوہِ نور، لاہور، ص ۱۰۹
۷۔ دامنِ باسین، ص ۲۲۳
۸۔ مکتوب حکیم محمد یوسف حضروی بہ نام سلیمان خان؛ مرقومہ ۳ رمئی ۱۹۱۴ء؛ مملوکہ راشد علی زئی، حضرو
۹۔ فلسفۂ شادی کے ابتدائیے میں حکیم محمد یوسف حضروی نے لکھا ہے: ''راقم الحروف آج اپنی زندگی کی اکانوے منزلیں طے کر چُکا ہے۔'' فلسفۂ شادی ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی، اس حساب سے حکیم صاحب کی تاریخِ پیدائش ۱۸۵۵ء بنتی ہے۔
۱۰۔ دامنِ باسین، ص ۱۲، ۴، ۱۳
۱۱۔ زئی، راشد علی: علامہ مولانا حکیم حافظ حاجی محمد یوسف حضروی، مطبوعہ روزنامہ جنگ، لندن
۱۲۔ مکتوب راشد علی زئی بہ نام ارشد محمود ناشاد؛ مرقومہ ۲۱/ اکتوبر ۲۰۱۸ء
۱۳۔ حضروی، حکیم محمد یوسف، ۱۹۴۴ء، سیرِ سوات، اکسیراتِ ہند دواخانہ، کلکتہ، ص ۱۹۰، ۱۹۱
۱۴۔ حضروی، حکیم محمد یوسف، ۱۹۴۶ء، فلسفۂ شادی، اکسیراتِ ہند دواخانہ، کلکتہ، ص، ب
۱۵۔ زئی، راشد علی: علامہ مولانا حکیم حافظ حاجی محمد یوسف حضروی، مطبوعہ روزنامہ جنگ، لندن
۱۶۔ مکتوب راشد علی زئی بہ نام ارشد محمود ناشاد؛ مرقومہ ۲۱/ اکتوبر ۲۰۱۸ء
۱۷۔ دامنِ باسین، ص ۳۴۴
۱۸۔ مکتوب راشد علی زئی بہ نام ارشد محمود ناشاد؛ مرقومہ ۲۱/ اکتوبر ۲۰۱۸ء
۱۹۔ ''تبصرہ'': عبدالماجد دریابادی؛ لکھنؤ، سچ؛ ۱۰/ فروری ۱۹۳۳ء
۲۰۔ زئی، راشد علی: علامہ مولانا حکیم حافظ حاجی محمد یوسف حضروی، مطبوعہ روزنامہ جنگ، لندن
۲۱۔ مقدمہ مشمولہ سیرِ سوات، ص ۴
۲۲۔ ایضاً: ص ۴۔
۲۳۔ سیرِ سوات: ص ا
۲۴۔ ایضاً، ص ب، ج
۲۵۔ ایضاً: ص ۸۰
۲۶۔ ایضاً، ص ۱۷
۲۷۔ ایضاً، ص ۱۱
۲۸۔ ایضاً، ص ۲۸، ۲۹
۲۹۔ ایضاً، ص ۳۰
۳۰۔ ایضاً: ص ۶۲، ۶۳
۳۱۔ ایضاً: ص ۹۵، ۹۶

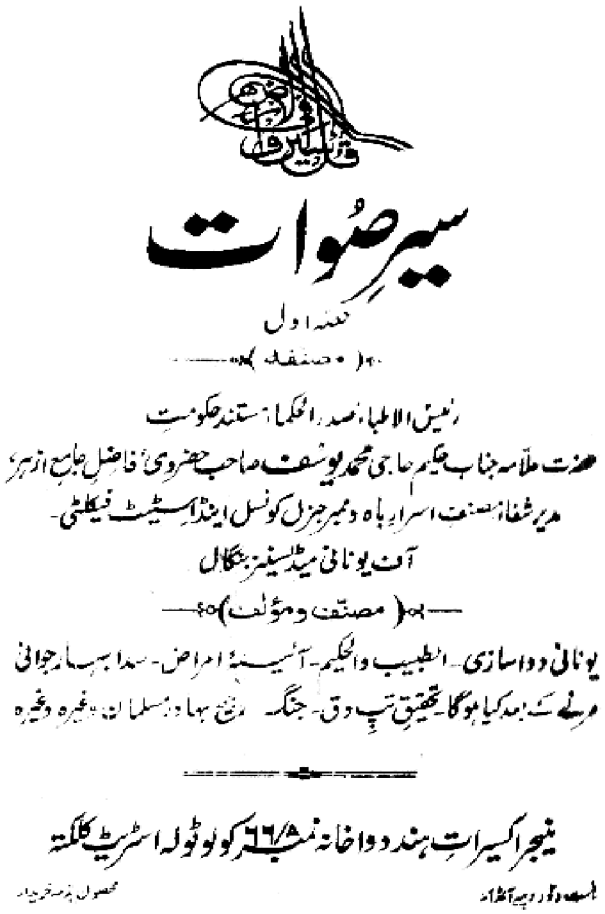

سیرِ صُوات

حصہ اول

۲۰ صفحہ

رئیس الاطبا، صدر الحکما، مستند حکومت

حضرت علامہ جناب حکیم حاجی محمد یوسف صاحب حضروی فاضل جامع ازہر

مدیر شفا، مصنف اسرار باہ و ممبر جنرل کونسل اینڈ اسٹیٹ فیکلٹی

آف یونانی میڈیسنز بنگال

(مصنف و مؤلف)

یونانی دواسازی - الطبیب والحکیم - آئینہ امراض - سدا بہار جوانی

مرنے کے بعد کیا ہوگا - تحقیق تپ دق - جنگ ... بہادر مسلمان وغیرہ وغیرہ

منیجر اکسیرات ہند دواخانہ نمبر ۲۶/۱ کولوٹولہ اسٹریٹ کلکتہ

قیمت ... روپیہ آٹھ آنہ محصول بذمہ خریدار

Abstract

This article aims at providing details about the life and works of Hakim Muhammad Yosuf Hazravi particular his travel writing Ser-e Sawat. It presents nine of his works. Yosuf Hazravi had two intensions to produce his travel experiences: first, he was compelled by his friends to share a month long journey and second, he wanted to dispel unfounded information about the people of Sawat and their traditions shared by the biased people especially European writers who visited the region as tourist. The concept of Hazravi about travel writing was also quoted as saying that a travel writer must present factual picture of the area visited to his readers. Keeping in mind the norms of writing travelogue, Hazravi discussed many things in it such as geographical importance, political atmosphere and administration of the region.

Keyword: Ser-e Sawat, early travel writing of Urdu, many facets of Sawat in late nineteenth century